پُت پینڈو کی ۱۵ کہانیاں [۱]

ڈاکٹر الماس خانم، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

"Siah Aank main Tasweer" is the first fiction book of Tararr. Aften that he wrote down many novel and travelling writers. His second book of fiction published in 2015 named "15 Kahaniyah". Most of stories presented post 9/11 Pakistan. Terrerism is a big issue of Pakistan, Pakistan is badly facing terrorism since last 15 years. The under research paper consisted the analysis of "15 Kahaniyah".

مستنصر حسین تارڑ کا نو خیز افسانوی مجموعہ ''۱۵ کہانیاں'' کے لئے مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ یہ مجموعہ ہاتھ میں آتے ہی نظر سرِ ورق[۲] پر پڑی تو دل دہل کر رہ گیا۔ تارڑ، فطرت سے عشق کرنے والا تارڑ، مٹی کے بطن سے پھوٹتے کومل ننھے ننھے پودوں کی رگوں سے آشنا تارڑ، پھولوں کی ایک ایک پتی کے ورق پر رقم داستان شناس تارڑ، جھیلوں کے نیلے، سبز شفاف پانیوں کی تہہ میں موجود سیپیوں، موتیوں، کنکروں سے آشنا تارڑ، ہواؤں کے ریشمی سرکتے آنچلوں کی ایک ایک تار گنتا تارڑ، خزاؤں کے بانجھ پن کو گل و گلزار کرنے والا تارڑ، رنگ، خوشبو، پھول، بکھیرتا، تارڑ، اسی تارڑ کے نئے افسانوی مجموعے کے خون کے دھبوں سے آلود سرِ ورق پر نظر پڑی تو دل واقعی دہل گیا۔ چند لمحوں میں ۲۰۰۰ء سے ۲۰۱۵ء تک کی پاکستان کی المناک تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ ان ۱۵ برسوں کو 9/11 Post کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ 9/11 Post کے پاکستان کی تصویر نظروں کے سامنے لائیں تو اس کے اس حسین و دلکش چہرے پر، جس کے ایک ایک خط کو تارڑ نے اپنے سفر ناموں میں اس مہارت سے ابھارا کہ بہت کم وقت میں محکمہ سیاحت سے ہزار گنا زیادہ نتائج برآمد ہوئے۔ اسی چہرے پر خون کے دھبے؟ تو کیا تارڑ کے نئے افسانوی مجموعے کا یہ سرورق صرف مجموعے کا سرورق ہے یا 9/11 Post پاکستان کا سرِ ورق۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان پندرہ برسوں میں قریباً ۳۵۰۰۰ سے زائد بے گناہ دہشت گردی کی نذر ہوئے۔ ہزاروں فوجی شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے۔ ان ۱۵ برسوں میں کتنے ننھے منے فرشتوں جیسے بچے موت کی وادی میں جا سوئے۔ قوم کا قیمتی سرمایہ نوجوان بے موت مارے گئے۔ کتنے بوڑھوں کے شکستہ جسم، یوں فضاء میں اچھالے گئے کہ ان کے مکمل وجودوں کو جنازے تک نصیب نہ ہو سکے، کتنی عورتیں موت کی آغوش میں جا سوئیں، کتنی عورتوں کے سہاگ اجڑ گئے، کتنے بچے یتیم ہوگئے، کتنے گھر خاک اور خون میں نہلائے گئے۔ اس سرِ ورق پر نظر پڑتے ہی صرف چند لمحوں میں دہشت گردی کے ہزاروں واقعات ذہن کے پر نقش ابھرنے لگے۔

سرورق پر خون کے دھبوں میں ڈوبی ''۱۵ کہانیاں'' میں ۱۵ کا ہندسہ بہت نمایاں ہے۔ ''۱۵ کہانیاں'' کا سرورق

معصوم، بے گناہ پاکستانیوں کے خون میں رنگا ہوا ہے۔ دیوار، دیوار پر خون کے گہرے سرخ دھبے، ایک طرف چند زینے اور ان زینوں میں مسلے اور کچلے ہوئے ایک انسان کی شبیہہ کہ جسے کسی بم دھماکے کا نشانہ بننے کے بعد نہ انسان کہا جا سکتا ہے نہ انسان کا لاشہ،خون کے دیگر دھبوں کی مانند وہ محض ایک دھبہ سا معلوم پڑتا ہے۔سرِ ورق کے اخیر پر نیچے ایک جالی اور وہ جالی بھی خون آلود۔زینوں کے پیچھے غالباً ایک دروازہ ہے۔ سیاہ دروازہ جس پر پتنگوں کی تصویریں ہیں۔ نا معلوم کیوں غور سے دیکھنے پر وہ پتنگے ڈرون سے مماثل نظر آئے۔ مزید غور پر خون کے دھبوں میں پھول کی پتیوں کے مدہم سے اُبھرتے ہوئے نقش نظر آئے اور بے اختصار میرا ذہن مجاز کے اس شعر کی طرف متوجہ ہوا۔

بہے زمیں پہ جو تیرا لہو تو غم مت کر
اسی زمیں سے مہکتے گلاب پیدا کر

مستنصر حسین تارڑ،قارئین کے اس استفسار پر کہ انہوں نے اپنی اس کتاب کے سرِ ورق کو خون کے چھینٹوں سے اس قدر رنگین کیونکر کیا ہے؟ اپنی فیس بک کی ٹائم لائن پر تحریر کرتے ہیں کہ:

''پچھلے دنوں تقریباً پچیس برس بعد میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ '۱۵ کہانیاں' شائع ہوا تو اس کے سرِ ورق کو جہاں بہت سے پڑھنے والوں نے پسند کیا وہاں کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے باقاعدہ احتجاج کیا کہ سرِ ورق پر خون کے چھینٹے طبع پر گراں گزرتے ہیں۔ اتنا خون چھڑکنے کی کیا ضرورت تھی،تو میں نے ان سے گزارش کی کہ ادبی کتابوں کے سرِ ورق بھی اس عہد کے سیاسی ،ثقافتی اور مذہبی رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں،اس مجموعے میں چونکہ بہت سی کہانیاں دہشت گردی اور مذہبی تعصب کے نتیجے میں ہونے والے قتل و غارت کو بیان کرتی ہیں،سانحہ بابو سر ٹاپ، سوات میں رونما ہونے والے پرتشدد واقعات،پشاور کے بچوں کے قتلِ عام اور ایک مسیحی جوڑے کو زندہ جلا دینے والے بہیمانہ سانحے کے بارے میں ہیں تو سرِ ورق پر خون کے چھینٹوں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔البتہ آپ اگر غور کریں تو خون کے ان چھینٹوں میں کہیں کہیں گلاب کے سرخ پھول بھی کھلتے نظر آتے ہیں یعنی کم از کم میں اب بھی امید کے شجر سے پیوستہ ہوں اور امید رکھتا ہوں۔''[۳]

مستنصر حسین تارڑ کے اس نئے مجموعے کے سرِ ورق پر خون کے دھبوں سے ابھرتے پھول اور پتے گویا اس حقیقت کے غماز ہیں کہ اس سرزمین پر بہنے والا لہو رائیگاں نہیں جائے گا بلکہ اسی سے مہکتے گلاب پیدا ہوں گے۔''۱۵ کہانیاں'' کی پہلی کہانی پڑھتے ہی یہ خیال یقین میں بدل گیا کہ اگر سری نگری کی ایک بے آب و گیاہ وادی کی سوکھی ویران پہاڑی پر پھول کھِل سکتے ہیں اور مکینوں کی خوشحالی کا باعث بن سکتے ہیں تو پاکستان میں جسے اللہ نے دُنیا و آخرت کی ہر دولت سے مالا مال کیا ہے مہکتے گلاب کیونکر پیدا نہیں ہو سکتے ضرورت صرف اس جذبے کی اس محبت کی ہے جس سے سرشار تارڑ کے والد نے ویران پہاڑی میں پھول کھلا دیئے'' پھولوں والی پہاڑی'' اس مجموعے کی پہلی کہانی ہے کہانی کا آغاز ان سطور سے ہوتا ہے۔

''میرے باپ کو مٹی سے عشق تھا۔۔مٹی میں سے جو بھی پھوٹتا تھا، اس کی کوکھ میں سے جو کچھ بھی جنم لیتا تھا، وہ اس کا راز داں تھا۔۔ پتے پتے ،بوٹے بوٹے کا حال جانے تھا۔۔''[۴]

یہ کہانی مستنصر حسین تارڑ کی زندگی کی حقیقی کہانی ہے اس میں انہوں نے اس واقعے کا ذکر کیا ہے جو ان کے والد کہ جنہیں مٹی سے اس حد تک پیار تھا اوراس کی ایسی شناخت رکھتے تھے کہ وہ دور دراز کے خطوں سے لائی جانے والی مٹی کے نمونوں کے بارے میں نہ صرف یہ جان جاتے کہ مٹی کو کیا امراض لاحق ہیں بلکہ اس کا علاج بھی تجویز کرتے۔ان کی وجہ سے بنجر نا کارہ مٹی کے ٹکڑے دیکھتے ہی گل وگلزار میں بدل جاتے۔تو یہ واقعہ ان کے والد کا ہے کہ ایک بار سرینگر جاتے ہوئے راستے میں درہ بانہال پر کچھ وقت کے قیام کے دوران ان کی نظر ایک پہاڑی پر پڑی جو بے آب و گیاہ تھی اور اپنے اردگرد رہائش پذیر مکینوں کی تنگدستی اورحرماں نصیبی کی آئینہ دار بھی۔۔انہوں نے اس بے آب و گیاہ پہاڑی کی مٹی کی زرخیزی کو بھانپ کر اس میں بیج بکھیر دیئے اور جب اگلے برس وہاں سے گزرے تو وہ بے آب و گیاہ ٹیلہ خوبصورت رنگے برنگے پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا اور وہاں سیاح جمع تھا اور مقامی لوگوں پر آسودگی تھی، اور وہ سب کے سب ان کے شکر گزار تھے۔وہ ہر سال جب بھی وہاں سے گزرتے اس پہاڑی کو بہاروں کا مسکن پاتے لیکن تقسیم کے بعد وہ پھولوں کی پہاڑی سرحد کے اس پار رہ گئی اور وہ دوبارہ اس پہاڑی کو کبھی نہ دیکھ پائے۔ وہ اکثر اس پہاڑی کو یاد کر کے اداس ہو جاتے۔یہ سادہ سی کہانی ہے لیکن جذبوں کی صداقتوں سے گل وگلزار ہے۔تارڑ اس کہانی کا اختتام ان الفاظ میں کرتے ہیں

> ''میرے باپ کا دم رخصت ہوگیا۔۔۔اسے نہلانے کے لئے آنے والے مقامی مسجد کے غسال کے گھر درے اور اجنبی ہاتھ ہمیں اچھے نہ لگے۔کہ کیا یہ ہاتھ ہمارے باپ کے بدن کو چھوئیں گے۔۔ہم تینوں بھائیوں نے خود اپنے باپ کو غسل دیا۔اس کی نیم وا نیلی آنکھوں میں مجھے شائبہ سا ہوا۔۔وہاں عجب رنگ نقش تھیا وران میں زندگی تھی۔وہ جھومتے لہلہاتے تھے اگر چہ وہ خود بے حس وحرکت پڑا تھا۔ جب ہم نے اس کے بدن پر نیم گرم پانی گرایا تو ایک مہک سارے میں پھیل گئی۔۔جیسے مدتوں سے پیاسی مٹی پر پہلی بارش کی پہلی بوندیں گرتی ہیں۔اس میں سے ایک دھول آمیز مہک اُٹھتی ہے۔ وہ خاک کا محرم راز تھا، رزق خاک ہوا۔اگر مٹی کا کوئی پیغمبر ہوتا،تو میرا باپ ہوتا۔۔'' ۵

''ایک گونگے کی ڈائری''میں خون کے وہ سارے دھبے نمایاں ہوگئے ہیں جو سرِ ورق پرنمایاں نظر آتے ہیں۔خون کے ان دھبوں نے اس پوری کہانی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اوراس کہانی کی ایک ایک سطر اور لفظ سے خون کے چھینٹے اڑتے محسوس ہوتے ہیں۔اس مختصر سے افسانے میں تارڑ نے کمال مہارت یا کمال ضبط سے سرِ زمین پاک وقوع پذیر ہونے والے ان ۹ خونین واقعات کواس طرح سمو دیا ہے جیسے دریا کوزے میں بند کیا جاتا ہے۔

یہ ۹ خونین واقعات نہ صرف دہشت گردی کے ۹ واقعات کی نشاندہی کرتے ہیں بلکہ دہشت گردی کی اس جنگ میں پاکستان کے کردار کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔گذشتہ چند برسوں میں پاکستان میں دہشت گردی کی لہر نے جو خونین کروٹیں لی ہیں اور جس طرح دہشت گردوں نے چہرے اور طریقے بدل بدل کر معصوم بے گناہ پاکستانیوں کوخون میں نہلایا ہے اس کی ایک فلم سی نظروں کے سامنے چل جاتی ہے دہشت گردی کے واقعات کا ایک تسلسل ہے جو یکے بعد دیگرے ایک عذاب کی صورت قوم پر نازل ہوا۔یہ واقعات نہ صرف دہشت گردی کے شکار معاشرے کے عکاس ہیں بلکہ دہشت گردوں کی پست ذہنیت کے بھی آئینہ دار ہیں۔ پاگل پن کی حدوں کو چھونے والی دہشت گردانہ سوچ ہر واقعے کے پیچھے کارفرما نظر آتی ہے۔تارڑ نے ان

خونین واقعات کو ایسے انگارے قرار دیا ہے جنہوں نے پاکستانی قوم کو گونگا بنا دیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ان واقعات کے وقوع پزیر ہونے کی وجہ پاگل پن کو قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک یونانی کہاوت ہے کہ .... آسمانی خدا جن قوموں کو برباد کرنا چاہتے ہیں، وہ انہیں پہلے پاگل کر دیتے ہیں۔۔۔میں اس کہاوت میں صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ خداؤں کو کچھ شوق نہیں ہوتا کسی قوم کو برباد کرنے کا۔۔ انہیں اس قوم کے سیاست دان۔۔عسکری قوتیں،صحافی،صنعت کار،جعلی دانشور، مذہبی پیشوا، اور پوری قوم جو بھیڑوں میں بدل چکی ہوتی ہے، مجبور کر دیتی ہے آؤ خدا ہمیں برباد کردو۔۔''۶

پہلا واقعہ اس ذہنیت کا عکاس ہے جو حوروں کی چاہ میں نہتے معصوم بچوں بوڑھوں عورتوں جوانوں پر بمبار جیکٹ سمیت پھٹتی ہے اور اپنے سامنے حور کے بجائے ایک نرس کو پا کر اپنی مایوسی کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہے۔

''کیا میں جنت میں ہوں۔۔۔اور جب وہ مہربان نرس اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے کہ بیٹا، میرے بھائی آپ شاور کے لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں ہوتو وہ ایک بچے کی مانند جو کہ وہ ہے، روٹھ جاتا ہے'آپ حور نہیں ہو۔۔۔میرے استاد کا فرمان کیسے غلط ثابت ہوسکتا ہے، انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ جب میرے پرخچے اُڑ جائیں گے اور مجھے پھر سے زندہ کیا جائے گا۔۔۔میرا ریزہ ریزہ ہو چکا، اُدھڑ چکا بدن پھر سے جڑ جائے گا اور میری دھماکے سے معدوم ہو چکی آنکھیں پھر سے ایک نور سے بھر جائیں گی اور جب میں انہیں کھولوں گا تو جنت کی حوریں، برہنہ اور منتظر ہوں گی۔۔۔تو آپ یقیناً ایک حور ہو کہ میرے استاد کا وعدہ باطل نہیں ہوسکتا ہے۔۔''۷

بچیوں کی سکول وین کو دھماکے سے اڑا دینا، ملک کی مقتدر ہستی کو دین کے نام پر قتل کر دینا، بسوں سے اتار کر ایک خاص مسلک کے بے گناہ لوگوں کو گولیوں سے بھون ڈالنا، اسلامیہ یونیورسٹی کی جوان طالبات کو خون میں نہلا دینا، وزیرستان کی سرسبز پہاڑیوں کے اندر ایک سکول بس کی بچیوں پر راکٹ برسا کر ان پہاڑیوں کو معصوم بچیوں کے مدفن بنا دینا، اور ایک بچی کو ٹارگٹ کر کے پوائنٹ رینج پر فائر کر دینا۔۔۔ان اندوہناک واقعات نے ایک چٹان جیسے حوصلے کے مالک، وطن عزیز کے چپے چپے سے محبت کرنے اور اسے سفر ناموں کی صورت لاکھوں لوگوں کی قلب ونظر کا حصہ بنانے والے کو ایسے الفاظ جنم دینے پر مجبور کر دیا کہ:

''علی شیر اس کا باپ اور بس کے بیشتر مسافر شعیہ ہونے کے ناقابل معافی جرم میں ان کے بچوں اور گھر والیوں کے سامنے باری باری اوندھے منہ ہوتے چلے جاتے ہیں، وہ ان سنگریزوں کی سلیٹی رنگت کو سرخ کر دیتے ہیں اور ان کے خون آلود ہونٹ اوندھے ہوتے ہوئے جب سنگریزوں کو بوسہ دیتے ہیں تو ان سے استغفار کرتے ہیں کہ اے مرے پیارے وطن، پاک وطن۔۔۔یا ناپاک وطن؟''۸

کیا یہ لمحہ، لمحہ فکر یہ نہیں کہ ایک محبّ وطن کا برسوں سے محبتوں کے بیج بوتے قلم کے بطن سے یکا یکا ''ناپاک وطن'' جیسے الفاظ جنم لینے لگیں؟ اور پھر اسی تسلسل میں وطن عزیز میں ۱۶ دسمبر کو ایک ایسا اندوہناک واقعہ وقوع پذیر ہوا جس نے

پوری قوم کو جڑوں تک ہلا کر رکھ دیا۔ازلی بزدل دشمن بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ:''آج ہم نے قوم کی شہہ رگ پر وار کیا ہے''

بلاشبہ یہ وار قوم کے ہر فرد کی شہہ رگ پر وار تھا۔ بچے جو نہ صرف کسی قوم کا اثاثہ بلکہ قدرت کا انمول تحفہ ہوتے ہیں، جن کی جگنوؤں جیسی روشن آنکھیں، پھولوں جیسے چہرے، پنکھڑیوں جیسے نازک ہونٹوں پر کھیلتی مسکان اور متوالی چال پر ہر دیکھنے والا فدا ہوتا ہے۔ بچے، خواہ قوم کے ہوں یا کسی ماں کے، کسی باپ کے وہ ماں باپ اور قوم سب کے جگر گوشے ہوتے ہیں۔ظالم اور بزدل دشمن نے پشاور سکول پر حملہ کر کے جب پاکستانی قوم کے جگر گوشے نوچ ڈالے تو کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشک بار نہ ہو۔اس نوحے پر جتنا لکھا جائے اتنا ہی کم ہے۔اس موضوع پر لکھے گئے سینکڑوں ناول، لاکھوں اشعار، ہزاروں افسانے بھی کسی ایک ماں یا باپ کے دکھ کا مداوا نہیں ہو سکتے۔

''اے میرے ترکھان'' اسی موضوع پر دل دہلا دینے والی کہانی ہے۔ایک ۷۵ برس کا بوڑھا ایک ایسے ترکھان کی تلاش میں ہے جو اس کے بچپن میں کبھی بچوں کے لئے ''طوطا'' (لکڑی کا تین پہیوں والا رانگلا ریڑھا)،لٹو، گلی ڈنڈا بنایا کرتا تھا۔آج اسی ترکھان سے ایک ۷۵ سالہ بوڑھے کو کچھ ایسا بنوانا تھا جو بننا تو بچوں کے لئے ہی تھا لیکن زندہ ہنستے کھیلتے بچوں کے لئے نہیں بلکہ پشاور اسکول کے ان ننھے منے، جوانی کی حدوں کو چھوتے معصوم شہیدوں کے لئے جنہیں بزدل دشمن نے گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔ان کے بے لوث محبتوں سے لبریز سینے چھلنی کر دیے تھے۔ان کے شرارتی معصوم چہروں میں سوراخ کر دیے تھے۔ایک بوڑھا ان معصوم پھولوں کے لئے تابوت بنوانے کا خواہش مند ہے وہ ترکھان کی منت کرتا ہے۔

> ''تو اے میرے ترکھان ---نہ 'طوطا' بنوانے، نہ گلی ڈانڈا اور نہ ہی لٹو گھڑوانے اور نہ ہی کسی ہیر کے رانگلے پلنگ کی فرمائش لے کر آیا ہوں---'' مجھے تجھ سے ایک عجیب کام پڑ گیا ہے--- مجھے کچھ تابوت گھڑ دے---''۹

مزید لکھتے ہیں کہ:

> ''اور میں تجھ سے ہرگز یہ فرمائش تو نہ کروں گا کہ یہ تابوت بہت آراستہ اور دیدہ زیب بناوٹ کے ہوں جیسے یورپ کے ملکوں میں ہوا کرتے ہیں۔تو نہ ان پر کوئی پھول بنا، نہ پتوں اور بیلوں کی کچھ آرائش کر---بس وہ چھ تختے آپس میں پیوستہ کر کے صرف ایک سو پچاس تابوت بنا تو دے، میرے لئے اتنا تو کر دے---تو بچوں کے لئے پنگھوڑے تو بناتا ہی رہتا ہے، بہت کاریگر ہے تو بناوٹ میں اور ساخت میں اپنا کمال ایسا دکھا کہ وہ تابوت بھی ہوں لیکن پنگھوڑے جیسے ہوں---''۱۰

اور یہ آخری سطر پتھر سے پتھر دل انسان کے دل میں بھی دراڑیں ڈالنے کے لئے کافی ہے کہ:

> ''گھڑ دے--کچھ تابوت گھڑ دے--اے مرے ترکھان ہمارے نہیں جیئے، تیرے بچے جئیں، کچھ تابوت گھڑ دے۔''۱۱

کہانی ''جلا ہے جسم جہاں---'' کا آغاز ان سطروں سے ہوتا ہے۔

> ''میری سٹڈی ٹیبل پر ایک چار سالہ بچے کے بوٹوں کا جوڑا دھرا ہے اور اس پر کچھ دھول ہے جس میں سرخی کی آمیزش ہے--انہیں یہاں دھرنے والے بوڑھے سیاہ رنگت کے مسکین اور غربت زدہ شخص

کے چہرے پر بھی وہی دھول جمی تھی اور اس میں بھی سرخی کی آمیزش تھی، اس کی سیاہ آنکھوں میں راکھ تھی اور اس نے کہا تھا۔۔کیا یہ بوٹ تم سے کچھ کہتے ہیں، یہ باتیں کرتے ہیں ان پر سرخی کی آمیزش والی جو دھول ہے اس کے ہر ذرے میں ایک دل ہے جو جل گیا ہے۔۔ ہاں چار سال کے ایک بچے کے یہ کھلونا نما بوٹ باتیں کرتے ہیں۔۔'' ۱۲

یہ بوٹ اس چار سالہ بچے کے بوٹ ہیں جس کے ماں باپ کو مار پیٹ کر ایک بھڑکتے ہوئے الاؤ کی طرف دھکیلا جا رہا تھا اور وہ چار سالہ بچہ ہجوم میں گرتا پڑتا اپنے ماں باپ کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔اس انسانوں کے ہجوم میں اس معصوم بچے کا فریاد رساں کوئی نہ تھا کوئی ایک بھی نہیں، اس کے ماں باپ کے لئے ایسا دہکتا الاؤ سلگایا گیا ہے کہ جس میں اینٹیں پکائی جاتی ہیں۔جس کا کم سے کم درجہ حرارت ایک ہزار سینٹی گریڈ ہے اور ایک بپھرتا ہوا ہجوم تھا جو کہ اس معصوم بچے کے ماں اور باپ دونوں کو اس دہکتے الاؤ کا ایندھن بنانے کے لیے بے تاب تھا۔

''وہ ان دونوں کو مارتے پیٹتے اور وہ ادھ موئے ہو چکے تھے انہیں گھسیٹے ہوئے وہاں لے گئے۔۔ان میں سے کسی ایک نے وہ آہنی ڈھکن اٹھایا اور نعرہ لگایا' جھونک دو۔۔جلا دو'۔۔ وہ دونوں دھکیل دیئے گئے۔۔ نہ میں نے جھانکا اور نہ ہی کچھ جستجو کی کہ وہ کیسے پل بھر میں راکھ ہوئے، جیسے شمع کے شعلے کے قریب آنے والا ایک پروانہ راکھ ہوتا ہے۔۔ ایک ابھی تک زندہ وجود ایک لمحے میں کچھ بھڑکتا تو ہوگا۔۔ پھر خاک ہوتا ہو گا۔۔ میں نہ جان سکا کہ ان پر کیا گذری، البتہ ایک کڑکڑاہٹ کی آواز میرے کانوں میں مدہم سی آئی جیسے کیسی چینی مچھر مار ریکٹ کی زد میں آنے والا مچھر فوراً بھسم ہوتا کڑکڑاتا ہے۔میری سٹڈی ٹیبل پر دھرے ایک بچے کے بوٹ مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔'' ۱۳

یہ کہانی اس غیر انسانی واقعہ کے تناظر میں رقم کی گئی ہے کہ جس میں ایک زمیندار نےعیسائی میاں بیوی پر یہ الزام دھر کر اپنے علاقہ کے لوگوں کو مشتعل کیا تھا کہ انہوں نے قرآن پاک کی بے حرمتی کی ہے اور اس جرم کی پاداش میں مشتعل ہجوم نے ان دو جیتے جاگتے وجودوں کو دہکتے الاؤ میں دھکیل کر اپنا ''انسانی فریضہ'' ادا کر دیا تھا۔تارڑ نے چار سالہ بچے کے ماں باپ پر ٹوٹنے والی قیامت کی منظر کشی ایسے رقت آمیز انداز میں کی ہے جو سینے میں انسانیت کا درد رکھنے والے کسی بھی انسان کو ہلا کر رکھ دینے والی ہے۔

زیر نظر تحریر رقم کرنے کے دوران ظفر اقبال کا کالم ''مستنصر حسین کی 15 کہانیاں'' بھی نظر سے گزرا۔اس میں کالم نگار نے وضاحت کی ہے کہ ''میں یہ کالم صرف مزہ لینے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ ورنہ کہانی، اس کی تکنیک اور اس کے اسرار و رموز کے بارے میں مجھے اتنا ہی علم ہے جتنا کوئی تھانے دار کسی سول سرجن کے کام سے واقف ہو۔'' ۱۴ اس کسرِ نفسی سے کام لینے کے بعد کالم نگار نے تارڑ کی ۱۵ کہانیوں میں سے ''ایک سنو ٹائیگر کی سرگزشت'' کے انہونے پن، ''پھولوں والی پہاڑی'' کے مکالموں کی غیر موزونیت'' مکوڑے دھک مکوڑے'' کے غیر واقعاتی پہلوؤں، ''جوہڑ میں ڈوب چکی لڑکی'' کے واقعہ کے ناممکن ہونے،'' زرد پیراہن کا بن'' کے ہیرو کی کم عقلی (کہ وہ سوچتا ہی نہیں کہ یہ زرد پیراہن کسی بڑھیا کا بھی ہوسکتا ہے)،''ان کی مائیں بھی روتی ہیں'' کے بے تکے پن کی نشاندہی کی ہے اور کالم کے آخر میں تارڑ صاحب کو مزید لکھتے رہنے کی تلقین ہے۔سب سے پہلی

بات تو یہ کہ ظفر اقبال نہ تو ''کہانی'' کے فن سے ناآشنائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور نہ ہی ''جہلا'' کی فہرست میں خود کو شمار کر سکتے ہیں۔ان کی ناقدانہ تحریر پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے جس قدر عجلت میں یہ کہانیاں پڑھی ہیں اس سے کہیں زیادہ عجلت میں یہ کالم بھی لکھ بیٹھے ہیں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ تارڑ صاحب نے اپنے اس مجموعے کا عنوان ''15 کہانیاں'' رکھا ہے۔کہانی کے تانے بانے تلاش کرتے ہوئے اس کے سرے داستان سے جا ملتے ہیں داستان میں کچھ بھی انہونا، ناممکن، بے تکا نہیں ہوتا، ''ایک سنو ٹائیگر'' کی سرگزشت'' کو ہونی اور انہونی کے درمیان کی کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔تارڑ نے جس خوبی سے سنو ٹائیگر کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اس کہانی میں جو کہ بیانیہ ہے تارڑ نے سنو ٹائیگر کی حیات کے ایسے گوشے بے نقاب کیے ہیں جنہیں صرف ان کا زرخیز تخیل ہی صفحہ قرطاس کی زینت بنا سکتا تھا۔

''پھولوں والی پہاڑی'' بیانیہ ہے جس میں تارڑ کی منظر کشی اور جذبات نگاری اپنے جوبن پر نظر آتی ہے۔ظفر اقبال نے اس کہانی کے مکالموں پر اعتراض کیا ہے۔''پھولوں والی پہاڑی'' میں گنتی کے صرف چند مکالمے آئے ہیں جو واقعتاً اپنے کرداروں کے لحاظ سے موزونیت نہیں رکھتے مثلاً سکھ ڈرائیور کا مکالمہ'' خالصے تمبا کو نہیں پیتے مالکو'' ۱۵؎ اسی طرح ایک مقام پر بس ڈرائیور سگریٹ کی پیش کش یہ کہہ کر ٹھکرا دیتا ہے کہ'' درہ بانہال کی چڑھائی شروع ہونے کو ہے اور میں سٹیئرنگ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر احتیاط سے پر پیچ راستوں کو طے کرنا چاہتا ہوں'' ۱۶؎ ایک اور موقع پر ڈرائیور کا مکالمہ'' میں نشئی نہیں ہوں صاحب۔ پان سگرٹ، بیڑی وغیرہ کچھ نہیں پیتا'' ۱۷؎

مذکورہ بالا محض چند مکالموں کی وجہ سے اس کہانی کو رد کرنا یقیناً ممکن نہیں۔اس کہانی کی منظر نگاری، ربط اور تسلسل اس کے حسن کے امین ہیں۔اسی طرح کہانی ''مکوڑے دھک مکوڑے'' کا حسن ہی اس کے غیر واقعاتی پہلو ہیں۔تارڑ کو منظر نگاہی میں کمال حاصل ہے۔وہ مکوڑوں کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ صفحات پر مکوڑے سیاہ دھک مکوڑے حرکت کرتے اور وجود کے تندور میں رینگتے محسوس ہوتے ہیں۔افسانے کا آغاز ہی توجہ طلب ہے۔''مکوڑے سیاہ کالے۔۔دھک مکوڑے۔۔کالے سیاہ۔ جیسے کسی خطاط کی دوات کی سیاہی میں ڈوبے ہوئے'' ۱۸؎

یہ کہانی مرگ کی قربت کی فنا مہک کو محسوس کرتی ہوئی ایک ایسی عورت کی کہانی ہے کہ ''جس کی شریانوں اور رگوں کے تھمتے اٹکتے بمشکل رواں خون میں خواہش کا ایک تابوت گردش کرتا تھا'' ۱۹؎ ایسا تابوت جسے اسی آبائی قبرستان میں دفن ہونے کی خواہش تھی جس میں کہ اس کے بزرگوں کی ہڈیاں دفن تھیں۔اس کا اکلوتا بیٹا محمد شفیع نیو یارک میں رزق کی تلاش میں گیا ہوا تھا جس نے امریکی شہریت حاصل کرنے کے لئے زمانے کے دستور کے مطابق ایک ادھیڑ عمر ہسپانوی عورت کارلا سے شادی رچالی تھی اور واپس ماں کا منہ نہ دیکھا تھا۔اسی لئے اس کا نابینا بوڑھی کی لاوارث لاش کو گورکن نے ہی دفنایا۔مکوڑوں نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا اور تازہ قبر تک آ پہنچے کیونکہ ان کے سوا بوڑھی کی موت پر ماتم کرنے والا کوئی اور موجود نہ تھا۔

> ''تب اس لمحے جانے کہاں سے سیاہ مکوڑوں کی ایک ماتمی قطار قبرستان میں داخل ہو کر اس تازہ قبر تک آئی۔۔۔اس کی مٹی کو سونگھا اور پھر ایک ایک کر کے ہر مکوڑا بھربھری مٹی میں سرایت کرتا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔'' ۲۰؎

اور حیرت کا مقام وہ ہے جب ہزاروں میل کی مسافت پر نیو یارک میں محمد شفیع کے جسم پر رینگتے ہوئے نمودا ہو جاتے

ہیں۔

''سوگوار ماتم کناں محمد شفیع کے بدن کو بھی پہلے سونگھتے ، اور پھر اس پر چڑھتے اس کے ماس پر رینگتے تھے وہ کتنے فاصلے طے کر کے سمندر عبور کر کے اس کچی ڈھیری سے یہاں نیویارک تک اس اپارٹمنٹ میں چلے آتے تھے مکوڑے سیاہ کالے۔۔ دھک مکوڑے، کالے سیاہ۔۔۔ جیسے کسی خطاط کی دوات کی سیاہی میں ڈوبے ہوئے مکوڑے۔''۲۱

یہ مکوڑے شاید پچھتاوے کے مکوڑے تھے جو ہزاروں میل کی مسافت پر موجود محمد شفیع کو جو کہ ماں کی موت سے لاعلم تھا جھنجھوڑنے کے لئے آئے تھے تمام کہانی بیانیہ میں ہے اور زبردست تاثر کی حامل ہے۔''جو ہڑ میں ڈوب چکی لڑکی'' پر اعتراض ہے کہ جوہڑ گائے بھینسوں کے نہانے کی جگہ ہے اس میں ایک لڑکی کیونکر ڈوب سکتی ہے۔ یہ اعتراض سرے سے بے جا ہے۔لڑکی جوہڑ میں نہانے کی کسی کوشش کے دوران نہیں ڈوبتی بلکہ وہ اس جوہڑ میں اگنے والے نادرِ روز گار'' کاسنی پھول'' کے عشق میں گرفتار ہو کر اسے توڑنے کی کوشش میں اپنے بوجھ سے پھسل کر ڈوبتی ہے۔''ان کی مائیں بھی روتی ہیں''ہسپانوی کوہ پیماؤں کی کہانی ہے۔کوہ پیماؤں کی یہ مختصر سی ٹیم صرف تین افراد کارلوس،میکائل اور ماریا پر مشتمل ہے۔مستنصر حسین تارڑ ان کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں:

''کارلوس اور میکائل دونوں کوہ پیمائی کے جنون میں مبتلا، ہسپانوی البرز اور الپس کے کوہستانی سلسلوں میں بہت خوار ہوئے، بہت بھٹکے اور پھر میکائل نے کسی کوہ پیمائی کے میگزین میں ترچ میر کی سفید اور تنہا بلندی کی ایک تصویر دیکھ لی تو اس نے ماریا سے وعدہ کیا کہ وہ اسے شادی کے تحفے کے طور پر ترچ میر کی چوٹی سر کرنے کی صورت میں پیش کرے گا۔''۲۲

ماریا، کارلوس کی بیٹی اور میکائل کی منگیتر ہے،وہ تینوں ترچ میر کی چوٹی سر کرنے پاکستان آئے ہیں۔ماریا کوہ پیمائی کے دوران سفر کی کٹھنائیاں اور یخ بستہ ہواؤں کے جھکڑ سہہ نہ پائی اور موت کے منہ میں چلی گئی اور پھر قریباً سات برس بعد ماریا کی ماں ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے پاکستان پہنچی اور اپنی بیٹی کی قبر کی تلاش میں ان پہاڑوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی جو اس کی بیٹی کا مدفن تھے۔وہ اپنی بیٹی کے تابوت کو واپس لے جانے کے لیے آئی تھی۔مستنصر نے اس کہانی کا اختتام ان الفاظ پر کیا ہے۔

''وہ ماریا کے تابوت کو اسماعیل داد اور ترچ کے انہی جوانوں کی مدد سے جن میں سے ایک نے اسے دریافت کیا تھا، چترال لے گئی۔۔اپنی بیٹی کو واپس لے گئی۔۔آشی بی بی۔۔کیا اب بھی آپ یہی کہو گی کہ۔۔ان کی مائیں ان کے لیے نہیں روتیں۔۔''۲۳

اس ساری کہانی میں جنون اور عشق کے جذبوں کی کارفرمائی ملتی ہے۔اس عشق کو وہی محسوس کر سکتے ہیں جو برف کے عشق میں مبتلا ہو کر چوٹیوں کو سر کرنے میں جاں سے گزر جاتے ہیں۔فطرت کے عشق میں مبتلا سمندر کی گہرائیوں میں اترتے ہیں۔اور وہیں دفن ہو جاتے ہیں۔''زرد پیراہن کا بن'' کا کردار کھونٹی پہ لٹکتے زرد لباس کو دیکھ کر اس لباس کو پہننے والی کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے اور تمام عمر اس عشق میں گرفتار رہتا ہے۔ظفر اقبال کو اس کہانی پر اعتراض ہے کہ:

''کہانی 'زرد پیراہن کا بن' میں افسانے کا ہیرو دروازے سے ٹنگے جس لباس کی بو سے مست ہو کر اس نادیدہ لڑکی کا عاشق ہو جاتا ہے اور عمر بھر اس کے عشق میں مبتلا رہتا ہے، وہ لباس کسی بڑھیا کا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ ایک بڑھیا اور جوان لڑکی کے پسینے اور ان کی بو میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔''۲۴

حالانکہ تارڑ کہانی میں اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ:

''اگر میں ان سے اپنی وحشت سے مغلوب ہو کر یہ دریافت کرتا کہ دراز ے کی کھونٹی سے ایک کینچلی کی مانند لٹکتا زرد لباس کس کا ہے۔۔وہ ان کی منکوحہ کا، ہمشیرہ کا بلکہ والدہ کا بھی ہو سکتا تھا تو یہ کیسی اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہوتی۔۔صد شکر کہ میں نے ضبط کیا۔''۲۵

اس کہانی میں نفسیاتی پہلو غالب ہے۔اس کہانی کے تانے بانے''منٹو کے افسانے''بو' سے بھی جوڑے جا سکتے ہیں کہ محض بدن کی ''بو'' بھی عشق میں گرفتار ہونے کی وجہ بن سکتی ہے۔اس مجموعے کی آخری کہانی ''دھند کے پیچھے شہر تھا'' ہے۔یہ ایک طویل کہانی ہے۔اس کہانی میں ''بہاؤ'' کی بازگشت سنی جا سکتی ہے۔اس میں ''سندھیا'' بھی ہے اور ''موہنجو'' بھی۔مستنصر حسین تارڑ اپنی تحریروں میں اکثر مقامات پر ان دونوں کے عشق میں گرفتار دکھائی دیتے ہیں۔تارڑ کے پہلے افسانوی مجموعے''سیاہ آنکھ میں تصویر''اور دوسرے مجموعے''۱۵۔کہانیاں'' کے مابین پچیس برس کا طویل عرصہ حائل ہے۔اس دوران مستنصر حسین تارڑ کے سحر انگیز ناولوں اور سفر ناموں نے قارئین کے دل موہ لینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔اس مجموعے کی کہانیوں کا موضوع، ان کی گذشتہ تحریروں سے یکسر مختلف ہے۔بنیادی طور یہ آج کے پاکستان کا نوحہ ہے جو بری طرح دہشت گردی کا شکار ہے لیکن ہر محبِ وطن پاکستانی کی طرح مستنصر حسین تارڑ بھی ان حالات سے مایوس نہیں بلکہ پُر امید ہیں کہ یہاں خوشیوں کے پُھول ضرور کھلیں گے۔

حواشی:

۱۔ مستنصر حسین تارڑ نے''ہائے پُت پینڈؤ''کے عنوان کے تحت اپنی فیس بک کی ٹائم لائن پر اپنی یادداشتوں پر مبنی ایک تحریر رقم کی ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح اسکول کے بچے انہیں''ہائے پت پینڈؤ'' کہہ کر تنگ کرتے تھے۔یہ واقعہ خاصا دلچسپ ہے۔اسی بنا پر اس تحقیقی مقالہ کے عنوان میں مستنصر حسین تارڑ کے لیے''پُت پینڈؤ''استعمال کیا گیا ہے۔

۲۔ مستنصر حسین تارڑ نے فیس بک کی ٹائم لائن پر اپنی اس کتاب کے سرِ ورق کی تفصیلات بتائی ہیں کہ اسے بین الاقوامی شہرت یافتہ مصور عمران قریشی نے تخلیق کیا ہے جس کی تصویریں دُنیا کی بیشتر آرٹ گیلریوں میں آویزاں ہیں اور اس نے یہ سرِ ورق بغیر کسی معاوضے کے تخلیق کیا ہے۔

۳۔ https://www.facebook.com/Mustansar-Hussain-Tarar-130604500359665/timeline/29-08-2015

۴۔ تارڑ، مستنصر حسین، ۱۵۔کہانیاں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵، ص:۹

۵۔ ایضاً،ص:۲۶-۲۵

۶۔　ایضاً،ص:۱۲۷

۷۔　ایضاً،ص:۱۲۸

۸۔　ایضاً،ص:۱۳۱۔۱۳۰

۹۔　ایضاً،ص:۱۷۱۔۱۷۰

۱۰۔　ایضاً،ص:۱۷۱۔۱۷۰

۱۱۔　ایضاً،ص:۱۷۶

۱۲۔　ایضاً،ص:۱۷۷

۱۳۔　ایضاً،ص:۱۸۵

۱۴۔　http://dunya.com.pk/index.php/author/zafar-iqbal/2015-08-22/12377/58368385#.VgQGsdKqqko (22-08-2015)

۱۵۔　۱۵ کہانیاں،ص:۱۷

۱۶۔　ایضاً،ص:۲۱

۱۷۔　ایضاً،ص:۲۱

۱۸۔　ایضاً،ص:۳۶

۱۹۔　ایضاً،ص:۳۹

۲۰۔　ایضاً،ص:۴۵

۲۱۔　ایضاً،ص:۴۷

۲۲۔　ایضاً،ص:۱۰۵

۲۳۔　ایضاً،ص:۱۱۹

۲۴۔　dunya.com (22-08-2015)

۲۵۔　۱۵ کہانیاں،ص:۱۲۲

☆☆☆